اقبالؔ کی غزلوں کا فنی اور موضوعاتی مطالعہ

کلاسیکی اردو غزل گوئی کے عہد میں دو ایسے شاعر پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے تو تھوڑا بہت لیکن دوسرے نے پورے طور پر غزل کو موضوع اور فن کے اعتبار سے متاثر کیا پہلے غالبؔ اور دوسرے اقبالؔ۔

اقبالؔ اردو شاعری کے واحد ایسے غزل گو شاعر ہیں جنہوں نے سب سے کم غزلیں کہیں اور سب سے زیادہ شہرت پائی، اور یہ شہرت فقط ''آہ اور واہ'' کی نہیں بلکہ اعلیٰ ترین موضوعات اور اس کے اس کے طریقۂ اظہار کی بنا پر ہے۔ انہوں نے پوری زندگی میں سو سے بھی کم غزلیں غزلیں کہی ہیں لیکن موضوع اور فن کے اعتبار سے یہ غزلیں بہت معیاری ہیں۔ انہوں نے غزل کے میدان میں اپنی ایک الگ شناخت بنائی، فنی اعتبار سے نت نئے کامیاب تجربے بھی کیے اور شعری لوازمات کو بھی ملحوظ رکھا۔

فنی مطالعہ : اقبالؔ نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہی کی تھی۔ ان کی ابتدائی دور کی غزلیں پہلے شعری مجموعے ''بانگِ درا'' کی نظموں کے درمیان تین حصوں میں پر مشتمل ہے۔ موضوع اور فن دونوں اعتبار سے بانگِ درا کی غزلیں اقبالؔ کی اصل شناخت سے مختلف ہے۔ ان غزلوں میں اسلوب اور الفاظ روایتی انداز کے استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی اقبالؔ نے اپنے ابتدائی دور کی غزلوں میں کلاسیکی شعری روایت کی تقلید کی ہے۔ جو ان کے استاد داغؔ دہلوی، اور کچھ حد تک عمر اور ذوقی افتاد کے باعث تھی۔ ان غزلوں میں تغزل کا رنگ، شعریت، نغمگی اور رومانیت سب کچھ نظر آتا ہے، الفاظ اور اس کی ترتیب و ترکیب سب روایتی اسلوب میں ڈھلے ہوئے ہیں جو پڑھنے اور سننے میں ایک انداز کا لطف بھی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں مری سادگی دیکھ، میں کیا چاہتا ہوں

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

موت کا نسخہ باقی ہے اے دردِ فراق چارہ گر دیوانہ ہے میں لا دوا کیوں کر ہوا

لیکن اس دور کے آخری ایام کی غزلوں میں بھی فکر و نظر کے اعتبار سے اقبالؔ پھر اپنی الگ پہچان بنانے لگتے ہیں، جب وہ اپنی غزلوں کے مضمون اور الفاظ کے میں روایت سے ہٹ کر اس طرح کی تبدیلی لاتے ہوئے اس نوع کے اشعار کہنے لگتے ہیں :

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

فن اور ہیئت کے اعتبار سے غزل کا معاملہ یہ ہے کہ اس کے تمام اشعار میں الگ الگ مضمون بیاں ہوتے ہیں اور غزل کا

پہلا شعر مطلع اور آخری شعر، جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے مقطع کہلاتا ہے، لیکن اقبال نے ان روایت کی پابندی سے بھی اکثر انحراف کیا ہے۔ انہوں نے بغیر مطلع اور بغیر مقطعے کی بھی غزلیں کہی ہیں۔ اور کہیں ایسا بھی ہوا کہ غزل کے آخری شعر میں مقطع یا پھر اسی قافیہ اور ردیف میں شعر کہنے کے بجائے دوسرے قافیے اور ردیف میں شعر کہہ دیا ہے۔ مثال کے طور پر "بالِ جبریل" کی پانچویں غزل کا مطلع ہے :

کیا عشق ایک زندگی مستعار کا کیا عشق پائدار سے ناپائدار کا

اور اسی غزل کا آخری شعر ہے :

کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

دوسری بات یہ کہ اقبال نے "بانگِ درا" کی غزلوں کے بعد تقریباً مسلسل غزلیں ہی کہی ہیں۔ دراصل وہ روایت کی پابندی سے کہیں زیادہ خیال کی ترسیل کو اہم جانتے تھے۔ اقبال جب باقاعدہ طور پر فکری اعتبار سے شاعری کی طرف متوجہ ہوئے تو انہوں نے غزل ہو کہ نظم پہلے اپنے خیال کی ترسیل کو اہم جانا، جو اس کے سینے میں طوفاں کی مانند اٹھے ہوئے تھے اس کے اظہار کے لیے انہوں نے نظم اور غزل دونوں کا سہارا لیا۔ نظم میں تو خیر اس کی گنجائش ہے ہی لیکن جب وہ غزل میں اپنے موضوعات کو بیان کرنے لگے تو پھر انہوں نے فن کی بجائے خیال کی ترسیل کو تجدید دی اور مسلسل ایک موضوع پر غزلیں کہیں۔ "بالِ جبریل" کی بیشتر غزلیں اسی نوعیت کی ہیں۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ اقبال نے غزل میں فنی اعتبار سے نئی پہل کی تھی لیکن اقبال کی فکر، نظر اور اس کی شعری کیفیت کو دیکھتے ہوئے ایسا قطعی معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے شعوری طور پر فنی تجربہ کرتے ہوئے مسلسل غزلیں کہیں، بلکہ ان کے دل میں ہزارہا موضوعات اور خیال اظہار کا وسیلہ تلاش کر رہی تھیں اور اس کا اظہار اقبال نے غزل اور نظم میں یکساں طور پر کیا۔ یہی نہیں انہوں نے عنوانات کے تحت بھی غزلیں کہیں ہیں۔ "بالِ جبریل" میں ۲۵ اشعار پر مشتمل تین حصوں میں ایک غزل موجود ہے، جس کا مطلع ہے :

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا

غلط تھا اے جنوں، شاید ترا اندازۂ صحرا

مزے کی بات ہے کہ کلیم الدین احمد نے جن وجوہات کی بنا پر اردو غزل کو نیم وحشی صنف کہا تھا ان میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ غزل کے اشعار میں ربط نہیں ہوتا۔ لیکن اقبال کی غزل کو بعض اوقات وہ اس لیے پسند کرتے تھے، کیوں کہ اقبال کی بیشتر غزلیں مسلسل ہیں اور ان میں موضوع کے اعتبار سے اشعار کے درمیان ربط و تسلسل بھی پایا جاتا ہے۔

سچ پوچھیے تو اقبال کی غزلیں ہزاروں شعرا کے کلام کے درمیان بالکل منفرد معلوم ہوتی ہیں۔ جس میں ان کے موضوعات کے علاوہ اس کے طرزِ اظہار اور اس کے لیے استعمال ہوئے استعارہ، کنایہ، تشبیہ، تلمیح اور الفاظ ہیں۔ اقبال کی غزلوں کا یہ امتیازی وصف ہے کہ انہوں نے ان صنعتوں کے علاوہ اس کے اظہار کے لیے جن الفاظ کا استعمال کیا ہے وہ الگ معنوی حیثیت رکھتی ہے۔ لالہ، شوق، ساقی، مومن، خودی، فقر، حرم، سوز، مسلماں، قرآں، غلامی، پیری وغیرہ کو انہوں نے ایک نئے Dimention میں

استعمال کیا ہے۔علاوہ ازیں انھوں نے بعض اوقات قرآنی آیات کا بھی بخوبی استعمال کیا ہے جس سے ان کے الفاظ کی تفہیم اور اس کے استعمال پر گرفت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی غزلوں یا نظموں کا اسلوب اور الفاظ کا استعمال کچھ اس طرح ہے کہ ہم ان کے اشعار بغیر نام کے بھی دیکھ لیں تو شناخت کر سکتے ہیں کہ یہ اقبال کا شعر ہے۔

اقبال کی غزلوں میں استعارہ، کنایہ، تشبیہ کا اور تلمیح جیسی صنعتوں کا بھی بہت ہی خوبصورت استعمال ہوا ہے۔

تغزل کے اعتبار سے اقبال کی" بال جبریل" کی غزلیں سب سے زیادہ قابل توجہ ہیں۔ واقعی محبوب سے بات چیت کا انداز، شکوہ وشکایت، جو غزل کا خاص وصف اس کی بہترین مثال اقبال کی غزلوں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیں :

عجب مزا ہے ہے مجھے لذت خودی دے کر وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ نہ رہوں

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

نوائے صبحگاہی نے جگر خوں کر دیا میرا خدایا! جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے

واقعی کسی نے سچے اور اچھے شعر کی تعریف اس طرح کی ہے کہ "شعر پڑھنے یا سننے کے بعد آپ پر ایک کیفیت طاری ہو جائے"۔ اور یہ کیفیت تو ایک معنوی سطح پر ہوتی طاری ہو سکتی ہے۔لیکن اس کی سب سے بڑی وجہ ہے کلام میں سوز گداز کا پایا جانا۔شعر میں سوز گداز ہی اصل قاری کے جذبات کو برانگیختہ کر سکتا ہے۔ اور یہ کیفیت اسی شاعر کے یہاں پیدا ہوگی جس کا تخلیقی سیاق انتہائی حساس اور عملی رہا ہو۔ اور اقبال کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ زندگی بھر عشق خداوندی میں چور رہے، قوم وملت تیز پوری انسانیت کے لیے تڑپتے رہے، ان چیزوں کے شدت احساس نے اس کے کلام میں سوز گدازی ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ شعر پڑھنے کے بعد اس کا سیدھا اثر دل پر ہوتا ہے۔

یہ چند اشعار ملاحظہ ہو :

میری بساط کیا ہے؟ تب و تاب یک نفس شعلہ سے بے محل الجھنا ہے شرار کا

کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو یا رب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

موضوعاتی مطالعہ

اقبال کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے لیکن اس کے تحت وہ تمام شعری ہیت آجاتے ہیں جس پر اقبال نے طبع آزمائی کی ہے۔ اگر ہم ان کی تمام شعری ہیئتوں سے غزل کو الگ کر کے اس کے موضوع کا احاطہ کرنا چاہیں تو اس لحاظ سے فرق پیدا ہوتا ہے یعنی اقبال کی خالص غزلوں کے موضوع کا پھیلاؤ ان کی نظموں کے مقابلے تھوڑا کم ہے۔ ہم اقبال کی شاعری کا جو عروجی دور ہے جس میں ان کی شاعری فلسفہ اور اپنے خاص رنگ وآہنگ کے ساتھ وجود میں آرہی تھی اس وقت کی نظموں اور غزلوں میں موضوع

کا تناسب کم و بیش ایک ہے۔اس کے وجوہات جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا کہ یہ وہ زمانہ تھا جب اقبالؔ ہمہ وقت ایک الگ ہی کیفیت میں رہتے تھے اور اس کے ذہن و دل میں نادر خیالات اور موضوعات کا طوفان سا رہتا تھا جسے انہوں نے اپنی نظموں اور غزلوں دونوں میں بیان کیا ہے۔اردو دنیا جانتی ہے کہ اقبالؔ کے شاعری میں فلسفیانہ رنگ ہر نکات میں موجود ہے۔فلسفہ عشق، فلسفہ مرد مومن اور فلسفہ خودی جس نے ان کی فکر کی بلندی اور اور فلسفہ کے مختلف نظریات نے ان کی شاعری کو مزید پروان چڑھایا لیکن اقبال کے ابتدائی دور کی غزلوں میں روایتی موضوع ہی دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن فکر و فن اور اعلیٰ ترین موضوع کے لحاظ سے" بال جبریل" کی غزلیں قابل توجہ ہیں۔

مرکزی طور پر اقبالؔ کی غزلوں کا موضوع ملی، فکر و فلسفہ، تصوف، عظمت انسان اور تصور حیات و کائنات ہے۔ان تمام تر موضوعات کے ارد گرد ان کا تصور حیات و کائنات جو ایک خاص قوم کے علاوہ تمام انسانیت کے لیے ہے، چاہے اقبال نے اسے فلسفہ خودی کے وسیلے سے بتایا ہو یا فلسفہ مرد مومن کے وسیلے سے، ہر ایک جگہ ان کا یہی تصور کارفرما ہے۔اور ان تمام موضوعات کے بیان میں اقبال کے گہرے فلسفیانہ فکر اور مشاہدے کا بھی بڑا دخل ہے۔اقبال کے یہاں فلسفے کی کئی جہتیں ہیں جیسے:"فلسفہ عقل و عشق"،"فلسفہ خودی"،"فلسفہ مرد مومن" اور "فلسفہ حیات و کائنات۔

ملی شاعری کے زیر تحت اقبال کی زیادہ تر خطابیہ غزلیں ہیں، اور یہ خطاب دو جانب ہے ایک خدا دوسرے قوم۔اقبال کی شاعری کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ انہوں نے انسان کے دل کی بات جو ان کے اندر حیات و کائنات کے سلسلے سے ایک مسائل اور سوال کی شکل میں تھے اسے انہوں نے براہ راست خدا سے ہمکلامی کے ذریعے ادا کر دی ہے۔وہ خدا سے شکر اور شکوے کے انداز میں ہم کلام ہوتے ہیں اور تمام سوالات حیات و کائنات نیز عالم برزخ کے حوالے سے کرتے ہیں۔اور اقبال کا اصل کمال یہی ہے کہ انہوں نے سوال کیا! خدا سے ہمکلامی کے دوران خدا سے شکایت کے علاوہ انسان کی عظمت اور بلندی کا بھی احساس کراتے ہیں، انہیں انسان کے وجود اور اس کے جسم میں دھڑکتے ہوئے دل کا کے راز و نیاز اور اس کی قوت کا اور اس کی کمزوری کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔وہ اکثر انسان کا فرشتوں سے موازنہ کر کے اسے بعض انسانی خصوصیات کی بنا پر فرشتوں سے افضل بتاتے ہیں۔ساتھ ہی دوسری طرف وہ خدا سے بے پناہ عشق و محبت کے جذبے کو بھی عیاں کرتے ہیں اور شکوے کو بھی اسی والہانہ عشقیہ جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیں :

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا؟	مجھے فکر جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن	زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا
عالم آب و خاک و باد سر عیاں ہے تو کہ میں	وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں
باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں	کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر
مقام شوق تیرے قدسیوں کے بس کا نہیں	یہ کام انہیں کا ہے جن کے حوصلے ہیں زیاد

صوفیانہ شاعری کے اسلوب سے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر خدا کو حاکم اور بندے کو محکوم کے طور پیش کرتا ہے۔ دونوں میں مرتبے کے اعتبار سے دونوں کے درمیان ایک کھائی نظر آتی ہے لیکن اقبال نے اس کھائی کو پر کرتے ہوئے بندے اور خدا کے درمیان کے رشتے کو انتہائی والہانہ اور گہرا دکھایا جہاں کوئی حاکم محکوم نہیں بلکہ عاشق اور معشوق کی طرح مخاطب ہے، یا پھر دوست کی طرح۔ اقبال کا یہ جرأت بیان، ان کا خدا تئیں بے پناہ عشق و عقیدت کی بنا پر ابھر کر آتا ہے۔ اور اس انداز کو گستاخ نہیں بلکہ شوخ کہا جا سکتا ہے۔

میری نظر میں اقبال کی شاعری کا سب سے بڑا اور اہم موضوع تصور حیات و کائنات ہے۔ اگر ہم اقبال کی غزلوں کے علاوہ ان کی نظموں کا بھی مطالعہ کریں تو وہاں بھی مجموعی طور پر انسانی حیات، اس کی اہمیت، اس کے تقاضے، اس کے عمل کے رموز و نکات کے گوشے گوشے کی وضاحت ملتی ہے۔ اقبال نے اپنی غزلوں میں بھی اس موضوع کو بڑے ہی عالمانہ اور فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ چونکہ وہ ایک فلسفی بھی تھے لہذا اس موضوع پر ان کے منطقی رویے کا بھی بڑا دخل ہے جہاں انہوں نے باریک بینی کے ساتھ غور و فکر کرنے کے بعد ہی کوئی بھی بات کہی ہے۔ اور اس کام کے لیے ان کا دو Concept کام کرتا ہے، ایک نظریہ خودی اور دوسرا مرد مومن! اقبال نے ان دونوں پہلو کے ذریعہ انسانی حیات کی قدر و قیمت بتائی ہے۔ اسے انسان کی طاقت اور اس کی عظمت کا بخوبی انداز تھا، وہ جانتے تھے کہ یہ مٹھی بھر خاک کا پتلا اپنے اندر کس قدر خوبیاں لیے ہوئے ہے، لیکن ضرورت ہے یہ کہ اس حقیقت سے آشکار ہو جائے۔ اور اسی جذبے کے تحت اقبال نے فلسفہ خودی اور فلسفہ مرد مومن کے ذریعہ انسان کو دعوت عمل دیا، سوتے ہوئے کو جھنجھوڑا، انہیں للکار کر ہستی کی حقیقت سے واقف کرایا، انہیں زندگی کو زندگی کی مانند جینے کی ترغیب دی۔

اقبال نے انسان کو ہمیشہ حرکت و عمل کرنے کی طرف مائل کیا۔ ان کے نزدیک زندگی کا دوسرا نام حرکت و عمل ہے، اس کے خیالات اور اعمال بلند ترین ہونے چاہیے۔ وہ اپنے کیاں کر وہ اپنے حرکت و عمل اور جذبے کی بنا پر ہی تو فرشتوں پر بھی غالب ہے۔

تو خاک کی مٹی ہے اجزا کی حرارت ہے	برہم ہو، پریشاں ہو، وسعت میں بیاں ہو
اے طائر لاہوتی، اس رزق سے موت اچھی	جس رزق سے پرواز میں آتی ہو کوتاہی
تو ساز کے پردے میں مستور ہو لے تیری	تو نغمۂ رنگیں ہے ہر گوش پہ عریاں ہو
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے	خدا خود بندے سے پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر	تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

تصور حیات کو اقبال نے فلسفہ خودی اور مرد مومن کے ذریعہ بہت ہی واضح انداز میں بیان کر دیا ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے جسے ہم اور آپ فقط کسی ایک قوم سے نہیں جوڑ سکتے، بلکہ اس میں پوری زندگی ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی بھی آبرو ہے۔

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے	جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو روسیاہی
کافر ہے تو کرتا ہے شمشیر پہ بھروسہ	مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اقبال انسان کو آزاد رہنے کی تلقین کرتا ہے لیکن اس آزادی کا اشارہ بنیادی طور پر ذہنی اور جسمانی آزادی کے علاوہ نفس کی طرف ہے۔ کیوں کہ اس کی غلامی انسان دین ودنیوں دونوں ذلیل وخوار ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کی خودی مرجاتی ہے اور وہ فقط ایک زندہ لاش بن کر رہ جاتا ہے۔ آزادی انسان کے اندر خوداعتمادی، کچھ کرگزرنے کا جذبہ عطا کرتی ہے۔ اقبال کئی جگہوں پر غلامی اور آزادی کا فرق بتاتے ہوئے ہمیں آزاد انسان کی قوت وعظمت سے روشناس کراتے ہیں۔

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی　　جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے　　زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

اقبال نے انسان اور اس کی زندگی کے اس کمزوری کو بھی خدا سے شکوے کے انداز میں ہی بیان کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ تو ایک ایسی بشری کمزوری ہے جو ابتدا سے ہی انسان کے اندر رکھ دی ہے جس سے وہ آخری وقت تک نجات حاصل نہیں کرسکتا۔ اور وہ کمزوری ہے انسان کی آرزوئیں، ان کی تمنائیں، جس سے وہ مجبور ہے۔

کوئی دل ایسا نظر نہ آیا، نہ جس میں خوابیدہ ہو تمنا　　الٰہی تیرا جہاں کیا ہے! نگار خانہ ہے آرزو کا

اقبال انسان کو فقط ایک منزل کے سر کر لینے کو کامیابی نہیں کہتے ان کے خیال میں انسان کی پہنچ، اور اس کی منزل بہت وسیع ہے اسے ہمیشہ اپنے حرکت وعمل سے آگے کی طرف بڑھتے رہنا چاہیے۔ اقبال نوجوانوں یا پھر جملہ انسان اور بطور خاص ایک قوم کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں یہ اس بات کی سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسے زمین کے ہر خطے کے ساتھ ساتھ آسمانوں کی بلندیوں کو بھی چھونا ہے۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے　　ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

ستاروں پہ کمند ڈالنے سے مراد یہ ہے کہ قوم کے نوجوانوں کو ایک محدود دائرے میں نہیں رہنا چاہیے بلکہ اسے علم وہنر کے ہر ایک میدان میں آگے آنا چاہیے۔ قرآن شریف کی ایک آیت کا مفہوم ہے جس میں اللہ ارشاد فرماتا ہے کہ" دنیا کی تمام چیزیں ہماری آیتیں ہیں تم اس میں تدبر سے کام کیوں نہیں لیتے"۔

عشق اور معشوق اقبال کی بھی غزلوں کا موضوع ہے، لیکن ان کی غزلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا معشوق کوئی پری چہرے، کالی زلفیں، نرگسی آنکھیں شمشیر جیسے ابرو والا نہیں ہے بلکہ ان کا معشوق خدا ہے، اور قوم ہے۔ جہاں وہ دونوں کے تئیں والہانہ عشق ومحبت کے جذبے کو اپنے دردمندانہ اور سوز وگداز سے بھرے کلام کے ذریعہ واضح کرتے ہیں۔ خدا سے بے پناہ عشق کا جذبہ سب سے زیادہ بالِ جبریل کی غزلوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اقبال نے انسان اور خدا کے درمیان شرم اور جھجھک کے پردے کو اٹھا کر خدا سے اس انداز سے مخاطب ہوئے کہ جیسے کوئی دو جگری دوست آپس میں ہم کلام ہوتا ہے۔ اقبال عشقِ خداوندی و بندگی میں چور نظر آتے ہیں ان کے دل کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو ایمان وعشق سے منور نہیں ہو۔ اور یہ جذبہ عشق کبھی کبھی تو اس حد تک اقبال رگ و پے سمایا کہ اقبال یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ :

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے!　　جو مشکل اب ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے!

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا ؛ یا اپنا گریباں یا دامن یزداں چاک

دوسری بات یہ کہ اقبال کے یہاں عشق کا مقام بہت بلند ہے۔ اس کی نظر میں عشق وہ شے ہے جو ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہے کمزوروں قوت و حوصلہ عطا کرتی ہے۔ عشق انسان کو خطروں سے کھیلنا سکھاتی ہے اور اس کے اندر بہادری اور زندہ دلی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ اور اسی عشق کی بدولت تو انسان خدا کے نزدیک فرشتوں پر برتری ثابت کر پایا ہے۔ دیکھیے اقبال نے اس کی تعریف کس طرح کی ہے۔

عشق کی اک جست نے کر دیا قصہ تمام ؛ اس زمیں و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی ؛ کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

قوم کے تئیں یہ بے پناہ محبت کا جذبہ ہی تو ہے اقبال انہیں ان کے شاندار ماضی کا المناک حال سے موازنہ کر کے مستقبل کا آئینہ دکھایا اور اسے پھر سے اس مقام کو حاصل کرنے کی ترغیب دی۔

اقبال نے نظریاتی طور پر صوفی اور خانقاہی نظام پر بھی تنقید کی ہے لیکن ان کی یہ تنقید تصوف پر قطعی نہیں ہے بلکہ وہ اس طریق پر تنقید کرتے ہیں جس کے تحت انسان کا حرکت و عمل حجرے اور تسبیح تک ہی محدود ہے۔ وہ صرف اور صرف عمل کی بنا پر وعظ اور صوفیوں کے خلاف ہیں، لیکن یہ وہ صوفیا نہیں ہیں جنہوں نے ایک وقت میں دینی و دنیاوی سطح پر عملی کارنامے انجام دیے ہیں، ان کا اختلاف ایسے خانقاہی نظام سے ہے جو مسلمانوں کو فقط درویشی اختیار کرنے اور تنہائی میں بیٹھ کر تسبیح خوانی کراتی ہے۔ اقبال تو نیک حرکت و عمل کے قائل ہیں اور اسی کے ذریعہ دونوں جہاں میں چھا جانے کی ترغیب دی۔ یا دوسرے لفظ میں یہ کہہ لیں کہ دنیا میں رہ کر دنیا سے بیزاری اختیار کر لینا بہتر ہے دنیا سے بالکل قطع تعلق کر لینے۔ ان کے نزدیک تصوف کا اصل سبق تو روح اور بدن کی پاکیزگی ہے۔ ورنہ اس طریق سے تو سوائے ناکامی اور رسوائی کے کچھ ہاتھ نہیں آسکتا۔

کرے گی داور محشر کو شرمسار اک روز ؛ فقیہ و صوفی و ملا کی سادہ اوراقی

کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری ؛ کمال ترک ہے تسخیر خاکی و نوری

اقبال کی غزل گوئی کے حوالے سے رشید احمد صدیقی نے بہت حد تک اچھی بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

" اقبال کی غزلوں میں وہ، تمام باتیں نہیں جو اردو غزل میں بہت مقبول تھیں مثلاً رشک، رقابت، فراق و وصال، جسم و جمال کا ذکر، صنائع، بدائع اور زبان و بیان کی نمائش جن کے بغیر غزل، غزل نہیں سمجھی جاتی تھی اور جن کو ہمارے بیشتر شعراء اپنا اور اپنے کلام کا بڑا امتیاز سمجھتے تھے۔ اقبال نے اپنی غزلوں میں عام غزل گو شعرا کی طرح نہ زبان رکھی، نہ موضوع نہ لہجہ، بلکہ ایسی زبان، موضوع اور لہجہ اختیار کیا جن کا غزل سے کوئی ایسا رشتہ نہ تھا۔ اس کے باوجود ان کی غزلوں میں تنوع وتاثیر، شیرینی و شائستگی، نزاکت و لطافت کے علاوہ، جو اچھی غزل کے لوازم ہیں، وہ فرزانگی اور دلیری و دلبری ملتی ہے جو بعض مناظر فطرت اور صحف سماوی میں ملتی ہے۔ اقبال کی غزلوں کے سامنے ہم بے ادب یا بے تکلف ہونے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ "